خلافتِ ارض اور مسلم حکومتوں کے فرائض

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ایک بنیادی اقدام

از۔ جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی۔ ناظم فرقانیہ اکیڈیمی۔ بنگلور۔ ۵۰

(۱)

فتنہ و فساد کی روک تھام :

قرآنی نظریات کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو کائنات اور اس کے تمام مظاہر کا علم (علم اسماء) اس لیے عطا فرمایا تاکہ وہ ان مظاہر کو اچھی طرح پہچان لے اور ان سے صحیح تعارف حاصل کرکے ہر ایک سے اُس کے مرتبے و مقام کے مطابق برتاؤ کرے۔ اور دوسری حیثیت سے ان مظاہر میں ودیعت شدہ نعمتوں اور پوشیدہ فوائد سے بھی بخوبی مستفید ہوکر خلافتِ ارض کے مقاصد اور اس کے تقاضوں کو پورا کرے۔

خلافتِ ارض کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد فکری و نظریاتی اعتبار سے عالم انسانی کی رہنمائی کرنا اور دنیا میں امن و امان قائم کرنا بھی ہے۔ درحقیقت اصلاح عالم کی دو شکلیں ہیں :

۱۔ نظریاتی اعتبار سے دلیل و استدلال اور حجت و برہان کی زبان میں کلام کرکے اقوامِ عالم کو قائل کرانا اور ان کی گمراہیوں پر متنبہ کرکے عقلی و استدلالی حیثیت سے ان پر اتمامِ حجت کرنا۔

۲۔ بدامنی اور فتنہ و فساد کی صورت میں ــــ جب کہ نظریات محض نظریات نہ رہیں۔

بلکہ [illegible] کی شکل اختیار کرلیں ـــــ تلوار کے ذریعہ ان کی اصلاح کرتا۔ بالفاظ دیگر بوقت ضرورت فتنہ و فساد کی روک تھام اسلحہ کے ذریعہ کرتا۔

اگر آغاز اسلام اور خصوصاً دورِ رسالت اور خلافت راشدہ کے حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ اسلام کی ترویج و اشاعت میں اس کی حکمت عملی ان ہی دو باتوں پر مشتمل رہی ہے۔ اور اُس دور کی تمام جنگیں دفاعی نقطۂ نظر سے اور فتنہ و فساد کی روک تھام کے لیے لڑی گئی تھیں۔ مگر مخالفین اسلام نے مشہور کر دیا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ حالانکہ اسلام جیسے پُرامن اور انسانیت نواز مذہب پر یہ سراسر ایک بہتان ہے۔ جیسا کہ پچھلے ابواب کے تمام مباحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ اسلام سراسر ایک علمی و عقلی مذہب ہے جو ہمیشہ دلیل و استدلال اور حجت و برہان کو مقدم رکھتا ہے۔ اور تلوار اُٹھانے کی اجازت صرف اُسی وقت دیتا ہے جب کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ ہو، اور اسی حد تک دیتا ہے جس حد تک کہ فتنہ و فساد دب جائے اور کم سے کم خونریزی عمل میں آئے یعنی انسانی تمدن و معاشرت میں جو "فاسد مواد" ہو وہ نکل جائے اور جو جز انسانیت کا ناسور بن چکی ہو اس کو کاٹ کر پھینک دیا جائے، تاکہ معاشرے کا سُدھار عمل میں آسکے۔ اس اقدام کے بغیر دنیا میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ اور اللہ کے بندوں کو چین و سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم نے فلسفۂ اجتماعیات کے اس بنیادی اور اہم ترین اصول پر اپنے خصوصی انداز میں اس طرح روشنی ڈالی ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

اور اگر اللہ (اقوام عالم میں اپنی مصلحتوں کی بنا پر) ایک دوسرے کی مدافعت نہ کرتا تو خانقاہیں، مدرسے، عبادت خانے اور مسجدیں ـــــ جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا

ہے سب ڈھا دیے گئے ہوتے۔ اور اللہ ضرور اُن کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں، کیونکہ اللہ طاقتور اور زبردست ہے (۲۲: ۴۰)

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ غالب اور زبردست ہے اس لیے وہ اپنے دین متین کو بھی غالب اور زبردست دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ نزاکت اور کشمکش کے وقت اس کے دین ابدی کا پھریرا بلند کرنے والوں کو سربکف ہونا چاہیے، ورنہ دین کا وقار اور اپنی تہذیب و تمدن کا بچاؤ مشکل ہو جائے گا۔ نیز یہ کہ نظریاتی اعتبار سے جو ملت اصلاح عالم کی دعویدار رہی اس کو سب سے پہلے خود اپنے آپ کو مضبوط اور قوی بنانا چاہیے۔ اس سیاق میں "وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ" (اور اللہ اسی کی مدد کرتا ہے جو خود اس کی مدد کرے) کا یہی مطلب ہے۔

غرض اسلام عقلی اور نظریاتی اور پُرامن تبلیغ کا قائل ہے۔ دنیا کے دیگر متشددانہ فلسفوں (مثلاً کمیونزم[1]) کی طرح وہ زبردستی اپنے نظریات کو تھوپنے اور بے جا قتل و غارت گری کا قائل نہیں۔ اور جنگ کی اجازت صرف اسی وقت دیتا ہے جب کہ اپنی تہذیب و تمدن کو خطرہ لاحق ہو یا امن عالم کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ اس اعتبار سے آج روئے زمین پر اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو "پُرامن بقائے باہم"[1] کا قولاً اور فعلاً ہر اعتبار سے صحیح طور پہ قائل ہے۔

---

[1] یہ روسی کمیونزم کا نعرہ ہے جو محض ایک کھوکھلا دعویٰ ہے اور عملی دنیا میں اس کا کوئی وجود دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے برعکس روسی کمیونزم ماضی قریب میں رومانیہ، ہنگری، چیکوسلواکیہ اور اب افغانستان میں اپنی جارحیت پوری طرح ثابت کر کے خود اپنے اس نظریئے "پرامن بقائے باہم" کو غارت کر چکا ہے۔ اور اب پولینڈ اور دیگر ممالک میں مداخلت کر کے انھیں اپنا غلام بنانے کی فکر میں ہے۔

بہر حال آج دینِ اسلام کی نصرت اور اُس کے صحیح دفاع کے دو طریقے ہیں:

ا۔ علمی و عقلی اور نظریاتی اعتبار سے دینِ اسلام کی صحیح تبلیغ جو عصرِ جدید کا مزاج اور اس کے تقاضوں کے مطابق ہو، اس کا پہلا مرحلہ فکر و نظر کی اصلاح کے لیے سب سے پہلے "قرآنی علمِ کلام" کی تدوین ہے، جس کی ضرورت اور طریقۂ کار کے متعلق پچھلے صفحات میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

۲۔ مگر جب "پُرامن بقائے باہم" کو خطرہ لاحق ہو جائے، بالفاظِ دیگر جب طاغوتی قوتیں اسلامی مرکزوں پر چڑھ دوڑیں (جس طرح آج روس افغانستان پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے) تو اُس وقت ہتھیار سنبھال کر میدان میں آ جانا چاہیے اور ہر ممکن طریقے سے ان فتنوں کا استیصال کرنا چاہیے۔

ملک و ملت کا دفاع اسلام کی نظر میں:

یہی وجہ ہے کہ اہلِ اسلام کو عالمی سیاست کے مطابق فوجی و عسکری اعتبار سے اپنے آپ کو مسلح کرنے اور مخالفینِ اسلام کی ریشہ دوانیوں سے ہمیشہ چوکنا اور چوکس رہنے کی تلقین کی گئی ہے:

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ
بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ
وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ۝

اور تم لوگ اپنی مقدور بھر قوت اور گھوڑوں کا پڑاؤ (ہر وقت) تیار رکھو، جس کے ذریعہ تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھا سکو، اور اُن قوموں پر بھی جن کو تم (اس وقت) نہیں جانتے، اللہ اُن کو جانتا ہے (جن سے تمہارا سابقہ مستقبل میں پڑنے والا ہے۔) اور اللہ کی راہ میں (سامانِ جنگ کی تیاری پر) جو کچھ تم خرچ کروگے (اُس کا بدلہ) تم کو پورا ملے گا اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔ (انفال: ۶۰)

قرآنِ حکیم میں ہر دور کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں گھوڑوں کا

لفظ مصدر قدیم کی رعایت سے لایا گیا ہے۔ اور مابعد کے ادوار کی رعایت سے "قُوَّۃ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد ہر قسم کی قوت اور جدید سے جدید تر سامان جنگ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح "عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ" سے مراد دورِ نزول کے منکرین حق اور دشمنان اسلام ہیں۔ اور "وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِہِمْ" سے مراد مابعد کی قومیں۔ "تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰہِ" (تاکہ تم اللہ کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھا سکو) یہ مقصد عسکریت، فلسفۂ جنگ، خلافتِ ارض کی غرض و غایت اور امنِ عالم کی بنیادی اینٹ ہے۔ یعنی محض اس رعب و دبدبے ہی کی بدولت تمہیں امن و امان اور چین و سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کمزوری کی بدولت ہر قوم اور ہر ملک دبانے ستانے اور حق مارنے لگ جائے گا۔ کیونکہ عسکری اعتبار سے قوموں کی کمزوری اُن کی موت کے مترادف ہوتی ہے۔ یہ اصول کل کی طرح آج بھی بین الاقوامی حیثیت سے پوری طرح صحیح نظر آتا ہے۔

اس طرح یہ آیت کریمہ بیک وقت نہ صرف حتیّ المقدور جنگ کی تیاری اور اس کی راہ میں انفاق کی ترغیب و تحریص دلا رہی ہیں بلکہ خلافت ارض کا فلسفہ سمجھاتے اور مستقبل کے بارے میں کچھ پیش گوئیاں کرتے ہوئے اپنے متبعین کو چالاک دشمنوں سے چوکنا اور ہوشیار رہنے کی تلقین بھی کر رہی ہے، جو ہمیشہ مسلم حکومتوں کو دزدیدہ نگاہوں سے تاکا کرتے ہیں، جیسا کہ تاریخ اسلام شاہد ہے۔ خلافت ارض کے تعلق سے اس آیت کریمہ میں ہمارے لیے بہت سے اسباق و بصائر ودیعت کر دیے گئے ہیں، جن کی تھوڑی سی تفصیل اگلے صفحات میں پیش کی جا رہی ہے۔

جدید اسلحہ کی تیاری:

اس آیت کریمہ کا منشا جیسا کہ ظاہر ہو رہا ہے "فتنوں" کو کچلنے اور باطل سے نبرد آزمائی کے لیے بہتر سے بہتر ہتھیاروں کی تیاری ہے۔ آج تیر کمان، تلوار اور نیزے کا دور نہیں رہا، بلکہ بندوق، مشین گن اور ٹینکوں کا دور بھی بہت بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے۔ اب راکٹ، میزائل، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، نیوٹران بم، جراثیمی بم اور خلائی سیاروں کا دور ہے۔ اب انسان خلا میں

بیٹھ کر جنگ کرنے اور اجرام سماوی میں فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ تاکہ وہ اپنا دفاع مضبوط کر کے ایک ہی وار میں اپنے دشمنوں کا صفایا کر سکے۔

لہٰذا اقوام عالم کو قابو میں رکھنے کے لیے جدید سے جدید تر ہتھیاروں سے لیس ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر "تُرْهِبُونَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ" کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ مقصد "ٹھیک" کے چند ہتھیاروں کو جمع کر لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لیے بذات خود محنت اور جدوجہد کرنے اور خود کفیل بننے کی ضرورت ہے۔

یہ آیت کریمہ دنیائے اسلام کو صاف طور پر متنبہ کر رہی ہے کہ اہل اسلام ہمیشہ چوکنا اور حالت جنگ میں رہیں۔ ورنہ غفلت اور بے خبری کی صورت میں وہ اچانک حملوں کا توڑ اور صحیح دفاع نہیں کر سکیں گے۔ جیسا کہ ۱۹۶۷ء کی عرب —— اسرائیل جنگ شاہد ہے۔

آغاز اسلام میں چونکہ صحابۂ کرامؓ قرآن حکیم کے رمز شناس تھے اور اس کی حکمتوں کو بخوبی سمجھتے تھے اس بنا پر وہ فوجی (عسکری اعتبار سے ہمیشہ چوکنا اور ہوشیار رہا کرتے تھے۔ چنانچہ فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ (متوفی ۴۳ھ) نے اُس موقع پر جب کہ ملک مصر پوری طرح فتح ہو چکا تھا اور مسلمانوں کے لیے بظاہر کسی قسم کے خطرے کی کوئی بات نہیں تھی، اہل اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے جو بات فرمائی تھی وہ قیامت تک تمام مسلمانوں کو یاد رکھنے کی ہے جو ایک زرّیں تاریخی اُصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرمایا "انتم فی رباط دائم" (یاد رکھو کہ تم ہمیشہ پہرے پر ہو) یعنی تمہیں ہمیشہ اپنے دشمنوں سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

اور پوری تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلمانوں کو جو بھی ملکی وسیاسی نقصانات ہوئے اور اسلامی حکومتوں پر جو زوال وادبار طاری ہوا ہے وہ اسی زرّیں تاریخی اُصول کو فراموش کر دینے کے باعث ہے، چنانچہ سلطنت عباسیہ، مسلم اندلس (اسپین)، ملت اسلامیہ ہند، دولت عثمانیہ کے عروج وزوال اور خصوصیت کے ساتھ اُن کے آخری ادوار کے حالات اور خود عرب اسرائیل جنگوں کا جائزہ لیجیے تو آپ کو اس ربانی صداقت کی قدر وقیمت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

بہرحال تاریخ شاہد ہے کہ مسلم حکومتوں کا رعب و دبدبہ ــــ اُن کے عروج کے زمانے میں ــــ جب تک اقوام عالم پر چھایا رہا، خلافت اسلامیہ بھی برقرار رہی اور دنیا میں امن و امان بھی قائم رہا۔ یعنی اُن کی رواداری، عدم تعصب اور وسیع المشربی کی بنا پر۔ وہ نہ صرف اپنے ماتحت رہنے والی غیر مسلم رعایا کے جان و مال کے محافظ تھے بلکہ وہ اپنے ماتحت رہنے والی حلیف قوموں اور ملکوں کے بھی محافظ تھے۔ مگر خلافت اسلامیہ کے زوال کے ساتھ ہی روئے زمین پر طوائف الملوکی پھیل گئی اور ظلم و عدوان کا بازار گرم ہوگیا۔ یہ بھی ایک نقصان عظیم ہے جس سے عالم انسانی ملت اسلامیہ کے زوال کے باعث دوچار ہوا۔

ہماری اس کھوئی ہوئی شان و شوکت کو دوبارہ حاصل کرنے اور دنیا میں پھر سے امن و امان کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم خلافت ارض کی ذمہ داریوں کو سمجھائیں اور فوجی و عسکری حیثیت سے خود کو قوی اور طاقتور بنانے کی کوشش کریں۔ یہ بات خوب یاد رکھنا چاہیے کہ اس وقت دنیا میں جتنی بھی صنعتیں (Industries) کام کر رہی ہیں، ان میں فوجی و عسکری نوعیت کی صنعتیں سب سے زیادہ اور اول نمبر پر ہیں۔ (پھر اس کے بعد مختلف قسم کی ادویات کی صنعتوں کا نمبر آتا ہے۔) مثلاً مختلف قسم کی رائفلیں، مشین گن، توپ، ٹینک، قسم ہا قسم کا گولا بارود، ہوائی جہاز، راڈر، راکٹ، مزائیل، مختلف قسم کے بم، جنگی مشنری اور ایٹمی ہتھیار وغیرہ وغیرہ۔ اور اندازہ یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کے دیگر عسکری ساز و سامان اور کل پرزوں کی تیاری کے لیے ہزاروں صنعتیں کام کر رہی ہیں۔ آج دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کا حال یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے سائنسی اور صنعتی علوم کو جنگی ضروریات اور فاعلی استیار کی تیاری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے ان تمام علوم کو پوری قوت کے ساتھ فوجی طاقت کے حصول کی راہ میں جھونک دیا ہے اور لاکھوں آدمی دن رات ان مقاصد کے حصول میں پوری تندہی کے ساتھ مصروف ہیں؛ چنانچہ امریکہ کے صرف ایک خلائی صنعت کے ادارہ "ناسا" (NASA)[1] میں کام کرنے والے (۱؎ حاشیہ صـ۱۲ پر دیکھیے)

سائنس دانوں، انجینیروں اور دیگر افراد کی تعداد بارہ لاکھ سے زیادہ ہے۔ اسی سے آپ دیگر صنعتوں اور ان کے پھیلاؤ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمیں خصوصیت کے ساتھ جاپانی قوم سے سبق سیکھنا چاہیے، جس نے دوسری جنگ عظیم میں اپنا سب کچھ برباد کر دینے کے باوجود ہمت نہیں ہاری۔ بلکہ تن، من دھن کی بازی لگا کر صرف ایک ربع صدی میں نہ صرف دنیا کے صف اول کے صنعتی ممالک میں شامل ہو گئی بلکہ بہت سے ترقی یافتہ ممالک کو بھی پیچھے چھوڑ گئی۔ یہ معجزہ آخر کس طرح ظہور میں آیا؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ مسلسل محنت، جفاکشی اور مقصد سے لگن کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

ماہرین عسکریات کا کہنا ہے کہ ایک اچھی فوج تیار کرنے کے لیے جہاں ایک طرف بہتر-ن اسلحہ کی ضرورت پڑتی ہے تو دوسری طرف عددی طاقت اور تنظیم بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بہتر-ن اسلحہ، عددی طاقت اور تنظیم، یہ تین بنیادی عناصر ہیں جن سے کوئی اچھی فوج تشکیل پاتی ہے۔ اب اگر مختلف مسلم ممالک (جن کی تعداد اس وقت دنیا کے نقشے پر چالیس سے زیادہ ہے) کے درمیان صحیح معنی میں تال میل اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے اور اپنے وسائل کا بہتر سوجھ بوجھ کے ساتھ استعمال کیا جائے تو تینوں مقاصد بخوبی پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں۔ اور اس اقدام کے ذریعہ اتنے سارے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو بیان سے بھی باہر ہیں۔ باہمی اشتراک اور باہمی امداد و اعانت کا ایک ایسا منظر سامنے آسکتا ہے جو بے مثال ہو سکتا ہے۔ آج عالم اسلام کی عددی قوت ایک ارب کے لگ بھگ (۹۰ کروڑ سے زیادہ) ہے۔ اگر پورا عالم اسلام متحد ہو جائے تو ایک ایسی عظیم الشان قوت عالم وجود میں آجائے گی جو پورے عالم کو تہ و بالا کر سکتی ہے اور دنیا کی ہر سیاست پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ مسلم ممالک کی حیثیت اس وقت "کھوئی ہوئی بھیڑوں"

(بقیہ حاشیہ صلا) National Aeronautical And Space Administration.

پاکتاب کے منتشر اوراق کی طرح ہے۔ جب تک ان کے درمیان اتحاد اسلامی (PAN---Islamism) عمل میں نہیں آتا ہمارے ملی و اجتماعی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ ہم کو قرآن حکیم کا یہ سبق ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے:

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ یہ تمہاری امت ایک ہی اُمت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں۔ لہٰذا تم مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔ (مؤمنون: ۵۲)

جنگی ہتھیاروں کے لیے جنگی صنعتوں کا قیام ناگزیر:

اس وقت دنیا کے نقشے پر چالیس سے زیادہ مسلم حکومتیں نظر آتی ہیں۔ مگر سب کی سب فوجی و عسکری نقطۂ نظر سے کمزور اور اسلحہ کے معاملے میں بڑی قوموں کی دست نگر ہیں۔ یہ حقیقت میں سزا ہے اس بات کی کہ وہ "علم اسماء" اور "تسخیر اشیاء"[1] کے میدان میں پیچھے کیوں رہ گئیں!

طاقت کے اعتبار سے "قومی کمزوری" حقیقتاً قومی موت ہے۔ اور یہ قانون فطری، شرعی، تاریخی اور سیاسی ہر اعتبار سے صحیح ہے۔ یہ صحیفۂ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ کمزور قومیں اس کائنات گیتی میں زیادہ دنوں تک قومی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ بلکہ وہ جلد یا بدیر یا تو غالب اور طاقتور قوموں کا لقمۂ تر بن جاتی ہیں یا پھر اُن پر ذلت و مسکنت طاری ہو جاتی ہے۔

لہٰذا مقصد خلافت اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمان قومیں "تسخیر اشیاء" کے میدان میں خود آگے نہ بڑھیں اور "مادہ" میں ودیعت شدہ قوتوں کو زیر کر کے اُن کا صحیح استعمال نہ سیکھ لیں۔ اس وقت مسلم حکومتوں کے پاس وسائل کا ایک انبار موجود ہے۔ اگر وہ صحیح سوجھ بوجھ سے کام لے کر تسخیر اشیاء یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کود پڑیں تو بہت جلد دنیا کی کایا پلٹ سکتے ہیں اور موجودہ غیر یقینی صورت حال بدل سکتی ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے بُرہان کے پچھلے شمارے (خلافت ارض کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت)

اس وقت عرب ممالک کو خصوصیت کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس کرتے ہوئے جو دولت اللہ تعالیٰ نے انھیں دے رکھی ہے اس کا صحیح استعمال کرنا چاہیے۔ عرب ممالک آج اس پوزیشن میں ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو خلافت ارض کی از سر نو تشکیل و تعمیر میں ایک مؤثر، فعال اور مثبت رول ادا کر سکتے ہیں۔ اور پوری مسلم دنیا ان کے اقدامات کی تائید کے لیے ان کی پشت پناہ بن سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت (پندرھویں صدی ہجری میں) دنیائے اسلام کو ایک فیصلہ کن مرحلے اور بہت نازک امتحان میں کھڑا کر دیا ہے۔ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا۔ (جس نے کھلی آنکھوں سے کام لیا وہ فائدے میں رہا اور جو جان بوجھ کر اندھا بنا وہ زیاں کار ہوا۔)

اس مقصد عظیم کے حصول کے لیے محض چند کانفرنسیں منعقد کرا دینے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ جب تک کہ ایک ٹھوس پروگرام بنا کر مثبت طور پر کام شروع نہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے پہلے سائنسی تعلیم کو عام کرنے، سائنسی مراکز، سائنسی تعلیم گاہیں اور صنعتیں (Industries) قائم کرنے کی طرف فوری توجہ کرنی چاہیے۔

اس وقت عرب ممالک کا کثیر سرمایہ یورپ اور امریکہ کے بنکوں میں "بند" پڑا ہوا ہے یا اُس کا فائدہ غیر قوموں کو پہنچ رہا ہے[۱]۔ اگر وہ اسی سرمائے سے اپنے یا دوسرے مسلم ملکوں میں جدید صنعتیں قائم کریں تو اس کے نتیجے میں خود ان کو بھی فائدہ پہنچے گا اور ترقی پذیر مسلم ممالک کا بھی بھلا ہوگا، جو فنی (Technical) اعتبار سے کچھ نہ کچھ معلومات تو رکھتے ہیں مگر سرمایہ

---

[۱] ایک اخباری رپورٹ کے مطابق اس سرمائے سے جو سود حاصل ہو رہا ہے وہ مشنری اداروں کو تبلیغ مسیحیت کی خاطر دیا جا رہا ہے۔ کیونکہ عرب ممالک شرعاً سود لینے کے روادار نہیں ہیں۔ اور اصل رقم (راس المال) سے یورپین تجارتوں اور صنعتوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اس طرح ہم اپنے سرمائے سے مغرب کو ہر ہر اعتبار سے فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ کیا یہ ایک عجیب بات نہیں ہے؟

نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

عرب ممالک کو ایران اور امریکہ کے حالیہ واقعات سے سبق لینا چاہیے۔ خصوصیت کے ساتھ اپنے سرمائے کی حفاظت کے معاملے میں انھیں بہت زیادہ حسّاس اور فکرمند ہونا چاہیے کیونکہ ضرورت پڑنے پر دنیا کی یہ بڑی اور حریص طاقتیں ـــ تمام بین الاقوامی ضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ـــ کمزور قوموں کا سرمایہ تک ہڑپ کرنے سے نہیں ہچکچاتیں۔ بلکہ اس کو منجمد کر کے ان کو مفلس و قلاش کر سکتی ہیں۔ لہذا عربوں کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیے کہ آخر وہ سرمایہ، جس کو وہ "محفوظ" سمجھتے ہیں، کس کام کا جو بوقت ضرورت یا آڑے وقت میں نہ تو خود ان کے کام آسکتا ہو اور نہ اس سے دنیائے اسلام کا ہی کوئی بھلا ہو سکتا ہو!

ان تمام وجوہات کی بنا پر ضروری ہے کہ مسلم ممالک حسب ذیل اُمور پر خصوصی توجہ مبذول فرمائیں:

۱۔ فوری طور پر مسلم ممالک میں سائنسی اور صنعتی (Industrial) تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے سائنسی تحقیقات کے ادارے، مراکز اور سائنسی و فنّی تعلیم کے لیے خصوصی درسگاہیں (پالی ٹکنک اور انجینیرنگ کالج وغیرہ) زیادہ سے زیادہ تعداد میں قائم کیے جائیں اور عوام کو سائنسی و صنعتی تعلیم کے حصول کی مؤثر انداز میں ترغیب دی جائے اور سائنسی معلومات کو عام کرنے اور ان کو مقبول بنانے کے لیے کثرت کے ساتھ لٹریچر (اپنی قومی اور مادری زبانوں میں) شائع کیا جائے۔ یہ عمل دیگر تمام اقدامات کے لیے ایک بنیادی اینٹ اور اولین منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ مسلم ممالک میں مختلف مصنوعات اور جنگی اوزار تیار کرنے کے لیے فوری طور پر ضروری اور اہم صنعتیں قائم کی جائیں۔ پھر رفتہ رفتہ تمام آلات و اوزار اور ہر قسم کی مشینیں حتی المقدور خود ہی تیار کرنے کی کوشش کی جائے۔

۳۔ مسلم ممالک کی ایک مشترکہ تجارتی منڈی (کامن مارکیٹ) ہونا چاہیے۔ اس کے

ذریعہ ایک دوسرے کی ضروریات آپس میں بخوبی پوری ہو سکتی ہیں۔

۴۔ صنعت وحرفت کی ترقی کے لیے اپنے خام مال اور خام اشیاء کا تبادلہ جہاں تک ممکن ہو آپس ہی میں کر لینا چاہیے۔ بلکہ زیادہ بہتر ہوگا کہ جہاں پر خام مال پیدا ہوتا ہو اُسی ملک میں اُس کی صنعتیں قائم کی جائیں۔ اس طرح نقل وحمل کے اخراجات میں کفایت رہے گی۔

۵۔ جو ممالک فنی اور ٹیکنیکل حیثیت سے جانکاری رکھتے ہیں وہ آگے بڑھ کر (صنعتی ترقی میں) خام مال تیار کرنے والوں کی مدد کریں اور جو مالدار ممالک ہیں وہ ان صنعتوں کی ترقی میں سرمایہ لگائیں۔ اس طرح سہ گونہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور اس اقدام میں نوّے کروڑ مسلمانوں کے معاشی فوائد بھی چھپے ہوئے ہیں:۔

ان اقدامات کے ذریعہ حاصل ہونے والے بعض اہم ترین فوائد یہ ہیں:۔

۱۔ مسلم ممالک میں سائنسی اور صنعتی تعلیم کو فروغ حاصل ہوگا۔ جس کے نتیجے میں ایک عام بیداری پیدا ہوگی اور علمی وسائنسی تحقیقات واکتشافات کا ملکہ پیدا ہوگا، جو رفتہ رفتہ اُنھیں ترقی یافتہ قوموں کی صنعتوں میں لا کھڑا کرے گا۔

۲۔ مسلم ممالک اپنی ضروریات میں خود کفیل ہو جائیں گے اور ترقی یافتہ قوموں پر انحصار کم ہو جائے گا۔

۳۔ مسلم ممالک میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوگا جو اپنی قومی وملّی بقا اور تحفظ کے لیے بہت ضروری ہے۔

۴۔ مسلم ممالک سے جہالت اور بے روزگاری دور ہو جائے گی۔

۵۔ مسلم ممالک میں حقیقی اتحاد کی بنیاد پڑ جائے گی اور وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی اور مددگار سمجھنے لگیں گے۔ اور ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔ جو کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں) کا فطری اور ایمانی مظاہرہ ہوگا۔ کیونکہ دینی وایمانی رشتہ سب رشتوں سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ہیں۔ بہرحال جتنی جلد ہو سکے ان اقدامات کے ذریعہ بڑی طاقتوں کے چنگل سے آزاد ہو کر ہم کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ ورنہ دین الٰہی کے غلبے اور اس کے استیلاء و سربلندی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اپنی بنیادی ضرورتوں میں دوسروں کی محتاج بنی رہنے اور کاسۂ گدائی دراز کرنے والی قوم و ملت دنیا میں کبھی غلبہ و اقتدار کا خواب تک نہیں دیکھ سکتی۔ مسلم ممالک کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر قدرتی وسائل سے مالا مال کیا ہے اور اتنی بہترین جغرافیائی پوزیشن عطا کی ہے کہ وہ اس راہ میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ بلکہ جو چاہے وہ حاصل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ایک مرکزی آئیڈیالوجی کے تحت باہم متفق و متحد ہو جائیں۔ اب یہ مرکزی آئیڈیالوجی اور اتحاد باہمی کا یہ بنیادی اور مرکزی ستون سوائے دین الٰہی یا وحدت کلمہ کے اور کیا ہو سکتا ہے! اسی وحدت میں دنیائے اسلام کی تمام دینی و دنیوی بھلائیاں مضمر ہیں۔ اور اسی وحدت کلمہ کے باعث وہ متحد اور سرخ رو ہو سکتے ہیں۔ دوسری ایسی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے جو دنیا کے نوے کروڑ مسلمانوں کو متفق و متحد کر کے سب کو ایک اور شیر و شکر کر سکے۔

أَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ تم ہی سربلند رہو گے اگر تم مومن بن جاؤ۔ (آل عمران: ۱۳۹)

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ : عزت و بڑائی صرف اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور اہل ایمان کے لیے ہے۔ (منافقون: ۸)

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ط یقیناً اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا، جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ (رعد: ۱۱)

ایٹم بم کی حرمت پر قرآن کا فتویٰ :

اگر مسلمان علوم و فنون کے باب میں امام ہوتے تو وہ منشائے الٰہی کے مطابق "تسخیر اشیاء"

کا صرف افادی پہلو مدنظر رکھتے اور اس کے مُضر و ہلاکت خیز پہلوؤں سے گریز اختیار کرتے۔ آج حال یہ ہے کہ دنیا کی جنگ باز قومیں دنیا نے انسانیت پر جوہری و جراثیمی جنگ مسلط کر کے تمام انسانوں کو موت کی نیند سلا دینے کے درپے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ علم اسماء "صالح" ہاتھوں سے نکل کر "غیر صالح" ہاتھوں میں پڑ گیا۔ اور انھیں قابو میں رکھنے والی کوئی مؤثر طاقت باقی نہیں رہی۔ جب معاشرے پر مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو اس کا خطرناک نتیجہ وہی نکلا جس کو لا محالہ نکلنا چاہیے تھا۔ جب کسی برتر ہستی کے سامنے جوابدہی کا تصور ہی ذہنوں سے نکل گیا تو انسان تمام بندھنوں سے آزاد ہو گیا۔

یہ موجودہ جنگ باز انسانوں کی بڑی خطرناک روش ہے جو خود ان کے لیے پیام موت کی حیثیت رکھتی ہے اور انسان کا پورا مستقبل بھیانک اور تاریک نظر آتا ہے۔ یہ دراصل عالم انسانی کا ایک بہت بڑا اور زبردست نقصان ہے جو زوال ملت اسلامیہ کے بعد کے ادوار میں کلیسائی ناعاقبت اندیشیوں کی بنا پر پیش آیا۔ اور اب قیادت کے اس خلا کو پُر کرنا بظاہر بہت مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن جہاں تک دین ابدی کی فکری و نظریاتی قیادت کا تعلق ہے وہ اس مسئلے میں بھی پوری طرح عالم انسانی کی رہنمائی کر کے ایسے خطوط متعین کرتا ہے جن سے معاشرے کی تعمیر ہوتی ہو۔ اور اُن تمام غلط رجحانات پر بندش لگاتا ہے جو معاشرے کی تخریب کا باعث ہوں۔ اور یہ تمام خصوصیات ایک زندہ مذہب اور زندہ کتاب ہی کی ہوسکتی ہیں کہ وہ ہر حال میں عالم انسانی کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بہر حال جن آیات میں موجودات کائنات کی تسخیر کا ذکر کیا گیا ہے اُن ہی میں یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ ظاہری و باطنی تمام نعمتوں کا استعمال نوع انسانی کے فائدے اور کل بنی آدم کی بہبودی کے طور پر ہونا چاہیے۔ مثلاً:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ط کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ زمین اور اجرام سماوی

میں ہر چیز کو یہ سب کچھ اللہ نے تمہارے (فائدے کے) لیے مسخر کر دیا ہے۔ اور تم پر اپنی ظاہری و باطنی (تمام) نعمتیں پوری کر دی ہیں۔ (لقمان: ۲۰)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ط کیا تو نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے اور کشتیاں بھی اسی کے حکم سے سمندر میں چلتی ہیں۔ (حج: ۶۵)

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ط إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ٥ اور اس نے تمہاری (بہبودی) کے لیے ارض و سماوات کی تمام چیزوں کو رام کر دیا ہے۔ (یہ سب) اسی کی جانب سے (بطور تحفہ) ہیں یقیناً ان امور میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے دلائل موجود ہیں۔ (جاثیہ: ۱۳)

یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن حکیم میں بعض احکام لفظاً مذکور ہیں اور بعض معنوی اعتبار سے ودلیعت کر دیے گئے ہیں، جو غور و فکر کے باعث واضح ہوتے ہیں۔ اور اس طرح قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔ اور اس قسم کے مسائل کے استنباط میں بنیادی طور پر دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو عقلی حیثیت سے ان دلائل کا وزن ہو۔ اور دوسرے وہ شریعت سے مطابقت رکھنے والے ہوں۔ اس طرح عقل و نقل دونوں کی نظر میں ان کا قابل تحسین ہونا ضروری ہے۔ اس اعتبار سے آیات بالا میں غور کیا جائے تو بہت سے جدید مسائل میں بھی ہماری رہنمائی ہو جاتی ہے اور ہمیں تشفی بخش جوابات مل جاتے ہیں۔

پچھلے ابواب میں ظاہری و باطنی نعمتوں کی تفصیل بتائی جا چکی ہے[۱] اور بتایا جا چکا ہے کہ باطنی نعمتوں کے تحت مادہ اور توانائی کے وہ تمام اسرار آ جاتے ہیں جن سے انسان آج

---

[۱] ملاحظہ ہو برہان بابت جون ۱۹۸۱ء۔

فائدہ اٹھا کر بر و بحر کی تسخیر کر رہا ہے۔ جیسے برق، بھاپ اور اٹیمی توانائی وغیرہ۔ اب اس موقع پر غور فرمائیے اوپر کی تمام آیات میں "لکم"[1] کا لفظ لایا گیا ہے۔ اس میں لام (لَ) عربی زبان وادب کے قواعد کے اعتبار سے "غایت" یا "مقصد" کے لیے ہے۔ اس طرح یہ لفظ عربی ادب میں عموماً افادیت اور حصول منفعت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل لفظ "علی"[2] ہے جو نقصان یا ضرر کا پہلو دکھانے کے لیے لایا جاتا ہے۔ جیسے ارشاد باری ہے:-

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط جو کچھ اس نے کمایا اس کا فائدہ اسی کو ہوگا اور جو کچھ اس نے کیا اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا۔ (البقرہ: ۲۸۶)

یہ عربی زبان کی انتہا درجے کی اختصار پسندی کا ایک نمونہ ہے۔ غرض اس لحاظ سے ان آیات کا مطلب یہ ہوا کہ "تسخیر اشیاء" میں دنیائے انسانیت کا فائدہ اور تعمیری پہلو مدنظر رہنا چاہیے۔ پھر لفظ "نعمت" کا مفہوم بھی یہی ہے کہ وہ نوع انسانی کے لیے زحمت یا مصیبت نہ بنے بلکہ وہ خدائے رحمان کا عطیہ ہونے کی حیثیت سے ہر حال میں اس کی رحمت و رأفت کا مظہر رہے۔

اس لحاظ سے اسلام کی نظر میں جوہری بموں، نیپام بموں، جراثیمی بموں اور دیگر اٹیمی اسلحہ کا استعمال بہت برا اور سخت گناہ ہے، جو عالم انسانی کی تباہی و بربادی کا باعث تو ہے ہی مگر یہ بے گناہ اور معصوم انسانوں کی ہلاکت کا باعث بھی ہے۔ تمام بنی نوع انسان اسلامی نقطۂ نظر سے

---

[1] یہ ایک مرکب لفظ ہے، جو دو الفاظ سے مل کر بنا ہے: لَ + کُمْ۔ اس میں پہلا لفظ (لَ) ایک حرف جر (Preposition) ہے اور دوسرا لفظ (کُمْ) ضمیر متصل برائے جمع مخاطب ہے۔ اس مرکب لفظ کے معنی ہوئے: "تمہارے لیے"۔ اور حاصل مطلب ہے: "تمہارے فائدے کے لیے"۔

[2] یہ بھی ایک حرف جر ہے جو "پر" یا "اوپر" کے معنی میں آتا ہے۔

"عیال اللہ" (اللہ کا کنبہ) ہیں۔ لہٰذا وہ ان کی بلا وجہ اور بغیر کسی گناہ کے تباہی و بربادی کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام کی نظر میں ہر انسانی جان قیمتی اور قابلِ احترام ہے؛ بلکہ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ کسی انسان کو ــــ کسی جان کے عوض یا بغیر کسی فساد کے ــــ بلا وجہ مارنا اور خواہ مخواہ قتل کرنا گویا کہ ساری انسانیت کو قتل کرنا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط

جس نے کسی شخص کو کسی جان کے بدلے یا فساد کے بغیر جو زمین میں (اُس شخص سے پھیلا ہو) قتل کر ڈالے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ (مائدہ: ۳۲)

دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ ــــ ۱۹۴۵ء) میں امریکہ نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر صرف ایک ایک ایٹم بم گرا کر جو خوفناک تباہی مچائی تھی اور لاکھوں بے گناہوں کو سالہا سال تک جس جسمانی اذیت اور کرب میں مبتلا کر دیا تھا اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں[۱]۔ اس قسم کی عالمگیر تباہی، بے گناہ انسانوں کو آن کی آن میں موت کی نیند سلا دینا، شہروں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دینا اور نسل کشی بہت ہی معیوب اور سخت گناہ کا فعل ہے، جس کی قرآن حکیم کھل کر اور بہت واضح انداز میں مذمت کرتا ہے:

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ط

---

[۱] دونوں شہر تقریباً ایک ایک لاکھ (یا کچھ زائد) آبادی والے تھے؛ جو پوری طرح تباہ و برباد ہو گئے۔ اور کل آبادی تہس نہس ہو کر رہ گئی۔ مستند رپورٹ کے مطابق: "ہیروشیما میں اسّی ہزار شہری تیس ہزار فوجی ہلاک ہوئے اور چودہ ہزار اشخاص لاپتہ ہو گئے۔ نیز دس ہزار افراد شدید طور پر اور تیس ہزار افراد معمولی طور پر زخمی ہوئے۔" (ایٹم کی کہانی، ص ۱۰۵) یہ زخمی سالہا سال تک سخت اذیت و تکلیف میں مبتلا مختلف ہسپتالوں میں پڑے رہے، جن کی جسمانی حالت بالکل ناکارہ ہو کر رہ گئی تھی۔

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ اور جب وہ بر سر اقتدار آ جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اور کھیتی اور نسل کو تباہ کر دے[۱] حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا (بقرہ: ۲۰۵)

یہ تھا اس مسئلے کا نظریاتی حیثیت سے ایک مختصر جائزہ۔ مگر عملی حیثیت سے اور عملی دنیا میں اس وقت ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا کے دیگر ممالک ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح ہیں اور وہ فوجی لحاظ سے کمتر قوموں اور خصوصاً اسلامی ممالک کو ــــ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ــــ دھمکاتے رہتے ہیں تو کیا مسلم ممالک کو بھی "طاقت کا توازن" برقرار رکھنے کے لیے ایٹمی ہتھیار تیار کرنا چاہیے؟

ماہرین کا کہنا ہے کہ جب کسی ملک کے پاس ایسا ہتھیار موجود ہو جس سے دوسرا ملک محروم ہو تو وقت پڑنے پر پہلا ملک دوسرے ملک کے خلاف وہ ہتھیار ضرور استعمال کرے گا۔ مگر جب دوسرا ملک بھی اسی قسم کے ہتھیار سے مسلح ہو تو پھر پہلا ملک اس کے استعمال سے احتراز کرے گا۔ چنانچہ امریکہ نے دوسری جنگ عظیم میں جاپان کے خلاف ایٹم بم اسی وجہ سے استعمال کیا کہ جاپان اس قوت سے محروم تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو ایٹم بموں کی تباہی کو دیکھ کر جاپان کے ہوش اڑ گئے اور فوراً ہی اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عقل و منطق کا تقاضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک بھی اپنے دفاع کی خاطر ایٹمی ہتھیار تیار کریں۔ مگر جب دینی و شرعی نصوص کی طرف نظر جاتی ہے تو اس کی قباحت بالکل واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اب یہ فقہائے اُمت کا کام ہے کہ وہ تمام نصوص کو

---

[۱] قرآنی الفاظ میں بڑی لچک ہوتی ہے اور وہ جدید سے جدید تر ہر قسم کے مفہوم کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ "کھیتی اور نسل کی تباہی" یا قابل کاشت زمینوں اور انسانی نسلوں کو برباد کر دینے کا جو وسیع مفہوم آج پایا جاتا ہے وہ اس آیت کریمہ اور اس کے الفاظ کے عین مطابق دکھائی دیتا ہے۔

سامنے رکھ کر غور کریں کہ آیا "الضرورات تبیح المحظورات" (ضرورت ممنوعات کو بھی جائز کر دیتی ہے) کے کلیے کی رُو سے کم از کم "طاقت کا توازن" برقرار رکھنے اور اس کی تیاری کی حد تک اس کا جواز نکل سکتا ہے یا نہیں؟

ایک عبرت اور ایک خوشخبری:

یہ عجیب بات ہے کہ آج روئے زمین پر مسلمانوں کی تعداد کم وبیش ایک ارب ہے۔ اور چالیس سے زیادہ مسلم حکومتیں دنیا کے نقشے پر نظر آتی ہیں۔ ان میں سے بعض تیل کی دولت اور دیگر قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کی بنا پر نہایت درجہ خوش حال ہیں بلکہ دنیا بھر کی جائیدادوں کو خرید رہی ہیں۔ جسے دیکھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ چند ہی سالوں میں گویا کہ وہ ساری دنیا پر قابض ہو جائیں گی مگر جب ایک دوسرے لحاظ سے دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس کے باوجود دنیا میں اُن کا کوئی مقام نہیں ہے اور دنیا کا کوئی بھی بڑا ملک انھیں خاطر میں نہیں لاتا۔ بلکہ بڑی طاقتیں جو چاہتی ہیں وہی ہوتا ہے اور ان کی کوئی بھی بات نہیں چلتی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت فلسطین اور افغانستان وغیرہ کے حالات ہیں۔ آخر کیا بات ہے کہ اقوام عالم کے دلوں میں اہل اسلام کا رعب و دبدبہ قائم ہونا تو درکنار کوئی انھیں شمار اور گنتی میں بھی نہیں لاتا؟ حالانکہ حدیث شریف میں جن خصائص نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی دیگر انبیاء پر رسول اللہ صلعم کی امتیازی خصوصیات) کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک دشمنوں پر رعب اور دبدبہ بھی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں مذکور ہے:

عن جابر بن عبد اللہ الانصاری قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أعطیت خمساً لم یعطھن أحد قبلی۔ کان کل نبی یبعث الی قومہ خاصۃ، وبعثت الی کل أحمر وأسود، وأحلت لی الغنائم، ولم تحل لأحد قبلی. وجعلت لی الارض طیبۃ طھوراً ومسجداً۔ فأیما رجل ادرکتہ الصلاۃ صلی حیث کان۔ ونصرت بالرعب بین یدی مسیرۃ شھر۔ وأعطیت الشفاعۃ۔

حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی دوسرے (پیغمبر) کو نہیں دی گئیں: (۱) ہر نبی کی بعثت اپنی ہی قوم کے لیے مخصوص تھی، اور میری بعثت تمام سیاہ و سپید (اقوام) کے لیے ہے (۲) میرے لیے غنیمت کا مال حلال کر دیا گیا ہے، جو مجھ سے پہلے کسی دوسرے نبی کے لیے حلال نہیں تھا۔ (۳) میرے لیے پوری زمین پاک اور سجدہ گاہ بنا دی گئی ہے۔ لہٰذا جس شخص کے جہاں کہیں بھی (سفر و حضر میں) نماز کا وقت آجائے وہ وہیں پر نماز پڑھ لے۔ (۴) اور مجھے رعب دیا گیا ہے جو ایک ماہ کی مسافت تک (کارگر ہو سکتا) ہے۔ (۵) اور مجھے شفاعت (کا حق) دیا گیا ہے۔[۱]

اس چوتھی خصوصیت کے الفاظ یہ ہیں: "وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ بَيْنَ يَدَيْ مَسِيرَةِ شَهْرٍ"۔ اس کی تشریح میں علامہ محمد طاہر پٹنی تحریر فرماتے ہیں: الرعب: الخوف والفزع قد أوقع اللہ الخوف فی أعداء انه فخافوه من مسيرة شهر وفزعوا منه[۲] یعنی رعب کے معنی خوف اور گھبراہٹ کے ہیں، جو اللہ تعالیٰ آپ کے دشمنوں کے دلوں میں ڈال دے گا۔ لہٰذا وہ آپ سے ایک مہینے کی مسافت (کی دوری) سے خوف اور گھبراہٹ محسوس کرنے لگیں گے۔

اس سے مراد متعین طور پر ایک ماہ کی مسافت مقصود نہیں بلکہ اصل میں اس کی شدت و ہیبت کا احساس دلانا مقصود معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال سوال یہ ہے کہ آج دشمنوں کے دلوں میں یہ خوف اور گھبراہٹ یا مسلمانوں کا رعب و دبدبہ باقی کیوں نہیں رہا، جب کہ وہ آپ کے توسط سے آپ کی امت کے خصائص میں سے ہے؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، ۱/ ۳۷۰-۳۷۱، مطبوعہ دار الافتاء ریاض۔

[۲] مجمع بحار الانوار، ۲/ ۳۳۹، طبع حیدرآباد، ۱۹۷۰ء۔

اور اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہم نے دین سے روگردانی تو کی ہی ہے مگر دین کی اصل حقیقت و ماہیت کے سمجھنے میں بھی روگردانی اور اعراض سے کام لیا ہے۔ اگر دین کو اس کے وسیع تناظر یا اس کے صحیح منظر میں منظر میں دیکھئے تو یہ حقیقت ہم پہ پوری طرح واضح اور روشن ہو جاتی کہ دین کے شعائر اور ان کے دفاع کے لیے بھی بہت زیادہ دوراندیشی اور تمام مادی وسائل اور منصوبوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر ہم رسول اکرم صلعم کی سیرت طیبہ میں غور کریں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ آپ جس طرح ایک بہترین ہادی و رہنما اور شارع و قاضی — دینی و شرعی اعتبار سے — تھے؛ اسی طرح آپ دنیوی اعتبار سے بھی ایک بہترین مدبّر، دوراندیش، سیاست داں اور فوجی کمانڈر بھی تھے۔ چنانچہ حالات کی نزاکتوں اور تقاضوں کے لحاظ سے آپ حسب ضرورت اپنی کمان اور ڈپلومیسی[1] کا رخ متعین کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہمیں خصوصیت کے ساتھ جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق اور صلح حدیبیہ کے موقع پر نظر آتا ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

بہر حال یہ رعب و دبدبہ — جو خصائص نبوت محمدیہ میں سے ہے — اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ دین کی حقیقت اور اس کی ہمہ گیری کو سمجھا جائے اور پھر اس مقصد کے حصول کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔ اس لحاظ سے مادی ذرائع و وسائل کے حصول اور ان کی کارفرمائی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دینی اقدار سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ جب تک مادی حیثیت سے بھی خود کو طاقتور نہ کیا جائے، دشمنوں پر رعب طاری نہیں ہو سکتا اور کائنات ارضی کی تسخیر عمل میں نہیں آ سکتی۔ جس کی پیشن گوئی مسلم شریف کے

---

[1] موجودہ دور کی گندہ ڈپلومیسی نہیں جس میں جائز و ناجائز کی تمیز بالکل نہیں کی جاتی۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب تدبر و ہوشیاری کی حکمت عملی اور بیدار مغزی ہے۔ یہ لفظ ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ اور اس مفہوم کی ادائیگی کسی دوسرے لفظ کے ذریعہ مشکل نظر آتی ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی دوسرے (پیغمبر) کو نہیں دی گئیں: (۱) ہر نبی کی بعثت اپنی ہی قوم کے لیے مخصوص تھی، اور میری بعثت تمام سیاہ و سپید (اقوام) کے لیے ہے۔ (۲) میرے لیے غنیمت کا مال حلال کر دیا گیا ہے، جو مجھ سے پہلے کسی دوسرے نبی کے لیے حلال نہیں تھا۔ (۳) میرے لیے پوری زمین پاک اور سجدہ گاہ بنا دی گئی ہے۔ لہٰذا جس شخص کے لیے جہاں کہیں بھی (سفر و حضر میں) نماز کا وقت آجائے وہ وہیں پر نماز پڑھ لے۔ (۴) اور مجھے رعب دیا گیا ہے جو ایک ماہ کی مسافت تک (کارگر ہو سکتا) ہے۔ (۵) اور مجھے شفاعت (کا حق) دیا گیا ہے۔[1]

اس چوتھی خصوصیت کے الفاظ یہ ہیں: " وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ بَيْنَ يَدَيْ مَسِيرَةِ شَهْرٍ " اس کی تشریح میں علامہ محمد طاہر پٹنی تحریر فرماتے ہیں: الرعب: الخوف والفزع، قد أوقع الله الخوف فى أعدائه فخافوه من مسيرة شهر وفزعوا منه[2]

یعنی رعب کے معنی خوف اور گھبراہٹ کے ہیں، جو اللہ تعالیٰ آپ کے دشمنوں کے دلوں میں ڈال دے گا۔ لہٰذا وہ آپ سے ایک مہینے کی مسافت (کی دوری) سے خوف اور گھبراہٹ محسوس کرنے لگیں گے۔

اس سے مراد متعین طور پر ایک ماہ کی مسافت مقصود نہیں بلکہ اصل میں اس کی شدت و ہیبت کا احساس دلانا مقصود معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال سوال یہ ہے کہ آج دشمنوں کے دلوں میں یہ خوف اور گھبراہٹ یا مسلمانوں کا رعب و دبدبہ باقی کیوں نہیں رہا، جب کہ وہ آپ کے توسط سے آپ کی امت کے خصائص میں سے ہے؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، ۱/۳۷۰-۳۷۱، مطبوعہ دار الافتاء ریاض۔

[2] مجمع بحار الأنوار، ۲/۳۳۹، طبع حیدرآباد، ۱۹۷۰ء۔

اور اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہم نے دین سے روگردانی تو کی ہی ہے مگر دین کی اصل حقیقت و ماہیت کے سمجھنے میں بھی روگردانی اور اعراض سے کام لیا ہے۔ اگر دین کو اس کے وسیع تناظر یا اس کے صحیح منظر و پس منظر میں دیکھئے تو یہ حقیقت ہم پر پوری طرح واضح اور روشن ہو جاتی کہ دین کے شعائر اور ان کے دفاع کے لیے بھی بہت زیادہ دور اندیشی اور تمام مادی وسائل اور منصوبوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر ہم رسول اکرم صلعم کی سیرت طیبہ میں غور کریں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ آپ جس طرح ایک بہترین ہادی و رہنما اور شارع و قاضی — دینی و شرعی اعتبار سے — تھے؛ اسی طرح آپ دنیوی اعتبار سے بھی ایک بہترین مدبّر، دور اندیش، سیاست دان اور فوجی کمانڈر بھی تھے۔ چنانچہ حالات کی نزاکتوں اور تقاضوں کے لحاظ سے آپ حسب ضرورت اپنی کمان اور ڈپلومیسی[1] کا رخ متعین کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہمیں خصوصیت کے ساتھ جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق اور صلح حدیبیہ کے موقع پر نظر آتا ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

بہر حال یہ رعب و دبدبہ — جو خصائص نبوت محمدیہ میں سے ہے — اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ دین کی حقیقت اور اس کی ہمہ گیری کو سمجھا جائے اور پھر اس مقصد کے حصول کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔ اس لحاظ سے مادی ذرائع و وسائل کے حصول اور ان کی کارفرمائی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دینی اقدار سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ جب تک مادی حیثیت سے بھی خود کو طاقتور نہ کیا جائے، دشمنوں پر رعب طاری نہیں ہو سکتا اور کائناتِ ارضی کی تسخیر عمل میں نہیں آ سکتی۔ جس کی پیش گوئی مسلم شریف کے

---

[1] موجودہ دور کی گندہ ڈپلومیسی نہیں جس میں جائز و ناجائز کی تمیز بالکل نہیں کی جاتی۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب تدبر و ہوشیاری، حکمت عملی اور بیدار مغزی ہے۔ یہ لفظ ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ اور اس مفہوم کی ادائیگی کسی دوسرے لفظ کے ذریعہ مشکل نظر آتی ہے۔

اسی باب کی ایک دوسری حدیث میں اس طرح کی گئی ہے:

"حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: میں جامع کلمات کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔ مجھے رعب دیا گیا ہے۔ اور جب کہ میں سو رہا تھا زمین کے خزانوں کی کنجیاں لائی گئیں اور میرے سامنے رکھ دی گئیں۔ ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلعم تو رخصت ہو گئے اور تم ان خزانوں کو نکال رہے ہو۔[1]

اس حدیث میں "فَوُضِعَتْ بَیْنَ یَدَیَّ" (یہ کنجیاں میرے سامنے رکھ دی گئیں) کے الفاظ ہیں۔ اور ایک دوسری حدیث میں "فَوُضِعَتْ فِی یَدَیَّ" (یہ کنجیاں میرے ہاتھوں پر رکھ دی گئیں)[2] کے الفاظ موجود ہیں۔ مگر دونوں کا حاصل ایک ہے۔

یہ پیش گوئیاں اگرچہ صحابۂ کرامؓ کے دور میں ایک حد تک پوری ہو چکی ہیں،[3] جب کہ انھوں نے قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو پاش پاش کر کے اُس دور کے خزائن ارضی پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر عمومی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ بات قیامت تک ہر دور میں صادق آسکتی ہے۔[4] اس اعتبار سے یہاں بیان دونوں فقروں: (۱) مجھے رعب دیا گیا ہے، اور (۲) زمین کی کنجیاں میرے ہاتھوں پر رکھ دی گئی ہیں، کے درمیان بہت گہرا ربط و تعلق نظر آتا ہے۔ جس کی ترتیب یوں ہو گی:

۱۔ رعب و دبدبہ قائم کرنے کے لیے خود کو طاقتور بنانا ضروری ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، ۱/۳۷۱-۳۷۲۔

[2] ایضاً، ۱/۳۷۲

[3] ملاحظہ ہو مسلم کی شرح نووی، برحاشیہ صحیح مسلم، ۱/۱۹۹، رشیدیہ دہلی۔

[4] ان احادیث میں "خزائن الارض" کے الفاظ مذکور ہیں۔ اگر اس پیش خبری کا دائرہ صرف صحابۂ کرامؓ ہی کے دور تک محدود رکھا جائے تو "الارض" سے مراد ایک معہود ذہنی کے طور پر محض ایک مخصوص خطۂ ارض ہی ہو سکتا ہے، جب کہ وسیع معنی میں (بطور استغراق) اس سے پورا کرۂ ارض بھی مراد ہو سکتا ہے۔

۲۔ خود کو طاقتور بنانے کے لیے مادی آلات و وسائل سے بھی خود کو لیس کرنا ضروری ہے۔
۳۔ مادی آلات و وسائل میں ترقی ہی کے باعث ممالک فتح ہوتے ہیں اور سائنسی نقطۂ نظر سے خزائن ارضی ہاتھ آتے ہیں۔

اس رعب و دبدبے کے اُٹھ جانے کے باعث آج ملّت اسلامیہ کی جو ذلت و خواری دنیا بھر میں ہو رہی ہے اُس پر تبصرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ حالات آج ہر شخص اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں صراحتاً اس کی بھی پیش خبری حیرت انگیز طور پر ان الفاظ میں ملتی ہے:

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قریب ہے کہ (دنیا کی) تمام قومیں تم پر (متحدہ طور پر) ٹوٹ پڑیں، جس طرح کہ کھانا کھانے والے برتن پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ کیا اُس وقت ہم تعداد میں کم ہوں گے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تم اُس وقت بہت زیادہ تعداد میں ہو گے لیکن تم جھاگ (غُثَاء) کی طرح ہو گے، جس طرح کہ سیلاب کی وجہ سے (پانی پر جھاگ آجاتا ہے۔) اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا خوف دور کر دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری (وَہَن) ڈال دے گا۔ پوچھنے والے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ وہ کمزوری کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ دنیا کی محبت اور موت سے کراہت۔"[1]

اب یہاں پر دو چیزیں ہو گئیں: ایک تو دشمنوں کے دلوں سے ہمارے خوف یا رعب و دبدبے کا جاتا رہنا اور دوسرے خود ہمارے دلوں میں "وَہَن" (موت کی محبت یا لقائے الٰہی کے جذبہ و شوق[2] کے مقابلے میں دنیا کی محبت اور اُس سے پیار) پیدا ہو جانے کے باعث ان میں اغیار کا خوف داخل ہو جانا۔ گویا کہ ترتیب معکوس ہو گئی اور مقصد ہی الٹ گیا۔ لہٰذا اب جب تک کہ پھر دوبارہ موجودہ

---

[1] ابو داؤد، کتاب الملاحم، ۴/۴۸۴ - ۴۸۵، مطبوعہ حمص (سوریہ) ۱۹۷۳ء۔
[2] اس سے مراد دین اور اُس کے تمام تقاضوں پر عمل پیرائی کا جذبہ ہے۔

[illegible] وقت ہمارے حالات بھی معمول پر نہیں آسکتے۔ بالفاظ دیگر جب تک موجودہ مسلمانوں کے دلوں سے "وہن" دور نہیں ہوگا اغیار کے دلوں میں اُن کا "رعب" بھی داخل نہیں ہوسکتا۔ ایک چیز نکلے گی تو دوسری چیز داخل ہوگی۔ یہ ہمارے زوال وادبار کے اسباب ومحرکات کی بالکل صحیح صحیح نشان دہی ہے جو اس حدیث شریف میں ایک اعجازی انداز میں اور محض ایک لفظ کے ذریعہ نقاب کشائی کر دی گئی ہے۔ گویا کہ وہ ہم کو موجودہ طوفانی بھنور سے باہر نکلنے کا راستہ بھی بتا رہی ہے۔

لہٰذا ہمیں دوبارہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنے تمام ذاتی اغراض ومقاصد اور تمام دنیوی خواہشات کو ترک کر کے نیز نسلی، قومی، لسانی اور جغرافیائی ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہو کر محض دین الٰہی کی سربلندی اور رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر جدوجہد کرنی چاہیے۔ تب کامیابی ہمارے قدم چومے گی، نصرت الٰہی شامل حال ہوگی اور اغیار کے دلوں میں اللہ ہمارا رعب ودبدبہ بھی ڈال دے گا اور صلے کے طور پر ہم کو دنیا بھی عطا کرے گا۔ مگر دنیا اصل مقصود نہ رہے۔

احادیث ہی کی پیش گوئی کے مطابق اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے ذریعہ ایک ایسا وقت بھی ضرور آنے والا ہے جب کہ روئے زمین پر کوئی کچا پکا مکان ایسا موجود نہ رہے گا جس میں اسلام فاتحانہ طریقے سے داخل نہ ہو چکا ہو، اور ہر کوئی اسلام کے غلبے کو محسوس طور پر تسلیم کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنا سر نیاز جھکا نہ دے۔

لا يبقى على ظهر الارض بيت مدر ولا وبر الا ادخله كلمة الاسلام بعز عزيز وذل ذليل، امّا يعزّهم فيجعلهم من اهلها، أو يذلّهم فيدينون لها۔ قلت فيكون الدين كله لله[لہ]

روئے زمین پر کچا یا پکا ایسا کوئی مکان باقی نہ رہے گا جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمے کو

لہ مسند احمد، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الایمان، ص ۱۶، مطبع مجیدی کانپور۔